



تجزیات کا سیل رواں

مفتی منیب الرحمن

پاکستان تحریک انصاف کی حکومت کے سودن مکمل ہو چکے ہیں، وہ اپنی کامیابیوں کے دعوے کر رہے ہیں اور مخالفین انہیں ناکام قرار دے رہے ہیں۔ ویسے آئین و قانون میں تو یہ کہیں نہیں لکھا کہ کوئی بھی نئی منتخب حکومت اپنے ابتدائی سودنوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں یا نفع و نقصان کا تخمینہ لازماً قوم کے سامنے پیش کرے گی، اس بلائے ناگہانی کو جناب عمران خان نے خود دعوت دی ہے، اس کی بابت یہی کہا جاسکتا ہے: ”اے باد صبا! اس ہمہ آوردہ ٹسٹ“ یا:

جھٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھٹنا ابو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

سوا سے ہم اپنے شیدائیوں کو فعال اور متحرک رکھنے کے لیے ایک حکمت عملی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن چینل سے وابستہ ہمارے ایک کرم فرمانے سروے کے دوران مجھ سے پوچھا: ”آپ عمران خان کے پہلے سودن کی حکومت کو دس میں سے کتنے نمبر دیں گے، میں نے اُن سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا: ”یہ میرا شعبہ نہیں ہے، اس کے ماہرین ٹیلی ویژن چینلوں میں پائے جاتے ہیں اور آج کل ان کا میلا لگا ہوا ہے، دانش کے موتی لٹا رہے ہیں، کوئی پی ٹی آئی حکومت کی رفعت کو افلاک پر دیکھ رہا ہے اور کوئی اُسے یکسر ناکام قرار دے رہا ہے۔ الغرض اپنا اپنا معیار، زاویہ نظر اور انداز فکر ہے۔“ کسی بھی حکومت کے لیے سودن میں نتائج دکھانا آسان کام نہیں ہے، میں نے پہلے بھی لکھا تھا: ”حکومت کی پالیسیوں کے حقیقی نتائج سامنے آنے کے لیے کم از کم ایک سال کی مہلت دی جانی چاہیے، اتنی جلدی بھی کیا، فارسی میں کہتے ہیں: ”تجیل کار شیطان است۔“

ایک وزیر محترم نے اپنی کارروائی بیان کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے سودن میں محاصل (Revenue) میں اتنا اضافہ کیا ہے، دوسو بیس گاڑیاں نیلام کی ہیں، اتنی زمین واگزار کی ہے اور اس کا تخمینہ انہوں نے چند ارب روپے میں بتایا۔ اگر اُن کا دعویٰ درست ہے تو اُن کی کارکردگی بایں معنی لائق تحسین ہے کہ انہوں نے قومی اثاثے کو واگزار کیا اور ضرورت سے زیادہ گاڑیوں کو بوجھ بنائے رکھنے کے بجائے فروخت کر کے چند کروڑ روپے قومی خزانے میں جمع کر دیے ہیں۔ لیکن اس کو کارکردگی کے طور پر بیان کرنے کی گنجائش تو ہے، مگر محاصل میں اضافے سے تعبیر کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اربوں روپے کی زمین کی واگزاری کا دعویٰ جناب عمران خان نے بھی کیا ہے۔ محاصل میں

اضافہ اُسے کہتے ہیں کہ آپ نے ٹیکس کی وصولی کو بڑھایا ہو یا آمدنی میں اضافے کے لیے نئے وسائل ایجاد کیے ہوں یا پہلے سے موجود وسائل میں حسنِ کارکردگی اور شفافیت کی بنا پر اضافہ کیا ہو، پہلے سے موجود قومی اثاثے کو اپنے کھاتے میں ڈالنا قرینِ انصاف نہیں ہے، البتہ ان کی واگزاری قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

میں ایک عرصے سے لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ قومی معیشت اصل مسئلہ ہے اور تاحال اس کی غیر معمولی نشاۃ کے آثار نہیں ہیں، اللہ کرے ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہو، لیکن سرِ دست حقیقت یہی نظر آتی ہے اور اب تو وزیرِ اعظم نے کنونشن سنٹر میں خود کہا ہے: ”آنے والے دن مشکل نظر آرہے ہیں“۔ حکومت نے ترقیاتی بجٹ میں چار سو ارب روپے کی کمی کر کے قومی اخراجات اور آمدنی کے مجوزہ تخمینے میں فرق کو قدرے کم کیا ہے اور جب ہم حقیقی آمدنی میں اضافہ نہ کر پائیں تو اس طرح کی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اس سے اُن ترقیاتی منصوبوں سے وابستہ صنعتیں بھی متاثر ہوتی ہیں اور روزگار کے موقع بھی کم ہو جاتے ہیں، سو یہ دودھاری تلوار ہے۔ پس معیشت کے مسئلے کا اصل حل قومی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے، چار دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہے، لیکن ترقیاتی کاموں کو جام کر دینا ہرگز دانش مندی نہیں ہے، شاہراہیں، ریلوے نظام یعنی ذرائع نقل و حمل و آمد و رفت، تعلیمی ادارے، اسپتال، آب رسانی، گیس و بجلی کی پیداوار اور ترسیل کا نظام، ایندھن کی ضروریات اور شہری سہولتوں میں روز افزوں اضافہ ناگزیر ہے، کیونکہ ان کی طلب مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔

یوٹرن بھی ہماری سیاسی دشمنی میں ایک اضافہ ہے، اسے ہم اقدامِ معکوس یا رجعتِ قہرئی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جناب عمران خان کا یہ کہنا درست ہے کہ پہلے جذبات یا خواہشات کے تابع ہو کر پالیسیاں بنائی جاتی ہیں، لیکن جب چشمِ کشا حقائق سامنے آتے ہیں تو واپس پلٹ کر نظر ثانی کرنی پڑتی ہے، اس کو ہم حکمتِ عملی یا حقیقت پسندی سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ اس طرح کے مواقع انفرادی اور اجتماعی زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے میڈیا کی یہ ضرورت ہے کہ گلشن کا کاروبار چلتا رہے، اسٹوڈیوز میں برپا محفلیں بارونق رہیں، تو اس طرح کی اصطلاحات پر لطیفے، چٹکلے اور گرما گرم ابحاث سننے کو ملتی رہیں گی۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا نظام حکومت صدارتی نہیں بلکہ پارلیمانی ہے، اس میں وزیرِ اعظم اور کابینہ مل کر پارلیمنٹ کا حصہ بنتے ہیں، کیونکہ وزیرِ اعظم اقتدار اور اختیار حکومت اسی ادارے سے کشید کرتے ہیں۔ لہذا پارلیمانی روایات کا تقاضا یہ ہے کہ قومی پالیسیاں بحث و تمحیص اور منظوری کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کی جائیں، جیسے آج کل ہم برطانیہ میں دیکھ رہے ہیں کہ وزیرِ اعظم ٹرسامے نے یورپین یونین سے خروج کے لیے جو معاہدہ کیا ہے اور جسے بریگزٹ ڈیل سے تعبیر کیا جا رہا ہے، اُس کے لیے مسلسل پارلیمنٹ کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں اور پارلیمنٹیرین کے ہر سوال اور اشکال اور خدشات کا جواب پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر دے رہی ہیں، اسی لیے تو برطانوی پارلیمنٹ کو مدر پارلیمنٹ (اُمّ المرِ لیمان) کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پارلیمنٹ اس طرح کبھی بھی فعال نہیں رہی، بلکہ ہمیشہ برابر اسٹپ کے طور پر کام کرتی رہی ہے، تاہم اس کے کریڈٹ پر یقیناً اسلامی جمہوریہ پاکستان 1973 کا پارلیمنٹ کا متفقہ طور پر منظور کردہ دستور ہے، جس نے اب تک ملک کو ایک قومی میثاق کے ساتھ جوڑے رکھا ہے۔

جناب وزیرِ اعظم نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے عین مطابق اب تک مزاحمت اور محاصمت کی پالیسی کو اختیار کر رکھا ہے، یہ اُن کا اختیار ہے اور صادق القول رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو مان لو اور اگر تم سنو کہ کسی شخص نے



اپنی جبلت کو بدل دیا ہے تو تصدیق نہ کرو، کیونکہ وہ لوٹ پھر کر اپنی اصل فطرت کی جانب رجوع کر لے گا، (مسند احمد: 27499)۔ حاکم وقت کو خیر خواہی کی ہر بات کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیے اور کبھی بھی اپنی آنکھیں، کان اور دل و دماغ کے درپے بند نہیں کرنے چاہئیں۔ پارلیمانی سیاست میں یہ پسندیدہ شعائر نہیں ہے، کیونکہ عدالتی نظام کی اصلاح ہو، قومی ادارہ احتساب کی اصلاح ہو، مختلف اداروں میں صوابدیدی اختیارات کو ختم کر کے نظام کو شفاف اور غیر جانبدار بنانا ہو، تو اس کے لیے لازماً قانون سازی کی ضرورت ہوگی اور بجٹ کے علاوہ کسی بھی عام قانون کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے منظوری ضروری ہے، جب کہ ایوان بالا یعنی سینیٹ تاحال پاکستان تحریک انصاف کے کنٹرول میں نہیں ہے، ہو سکتا ہے 2021 میں ان کے کنٹرول میں آجائے، لیکن موجودہ پوزیشن یہی ہے۔ سو قانون سازی کے لیے حکومت کو اپوزیشن کے ساتھ عملی تعلقات کا قائم کرنا ضروری ہے۔

جناب وزیراعظم نے اپنے بہر شہر جناب فواد حسین چودھری اور چیتے جناب فیاض الحسن چوہان کو تاحال اتنی بے دردی سے استعمال کیا ہے کہ ہماری پارلیمنٹ میں تمام پارلیمانی روایات اور اخلاقی قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ لیکن اب انہیں چاہیے کہ سیاسی رنگ کے ان پہلوانوں کو کچھ عرصے کے لیے ریلیکس کریں، یہ تازہ دم ہونے کے لیے ڈنٹ پھیلیں اور اپنے جذباتی عضلات اور پٹھوں (Muscles) کی فزیوتھراپی کریں، سیاسی رنگ کا قومی چیمپین بننے کے لیے ابھی بہت عرصہ باقی ہے۔ مناسب ہوگا کہ وہ جناب شاہ محمود قریشی، جناب اسد عمر اور جناب ڈاکٹر فروغ نسیم کو موقع دیں کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ ورکنگ ریلیشن قائم کریں، قومی مفاد میں اتفاق رائے سے قانون سازی کی راہ ہموار کریں، اسی کے ذریعے نظام میں سر بلع العمل، دیر پا اور جوہری تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ پچھلی حکومت میں عقاب کم تھے اور فاختائیں زیادہ، اب تو عقاب ہی عقاب ہیں، کیونکہ پارٹی کلچر میں فاختاؤں کی گنجائش نہیں۔

جناب وزیراعظم کی خدمت میں آخری گزارش یہ ہے کہ تجاوزات کا خاتمہ یقیناً بے حد پسندیدہ کام ہے، لیکن اردو کا محاورہ ہے: ”دخسم کیا، برا کیا، چھوڑ دیا اور برا کیا“۔ تجاوزات کا قائم ہونا یقیناً غلط کام تھا، اس میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ تجاوزات کس کی اجازت یا چشم پوشی سے قائم ہوئیں، ان کے مالی فوائد کون سمیٹا رہا، اس کے ذمے داروں کا تعین کرنے اور انہیں قرار واقعی سزا دینے کے ساتھ ساتھ متاثرین کے نقصانات کا ازالہ بھی ضروری ہے اور یہ سارا کام حکمت و تدبیر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کراچی میں بڑی تعداد میں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں اور ان میں شاید زیادہ تر لوگ پی ٹی آئی کے ووٹر تھے، اُن کی بحالی کی فوری تدبیر ہونی چاہیے، یہ چند سو یا چند ہزار افراد کا مسئلہ نہیں ہے، یہ بڑی تعداد میں خاندانوں کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے کوئی سر بلع العمل اور با اختیار ٹاسک فورس بنائی جائے جس میں وفاقی اور صوبائی حکومت کے مجاز اور با اختیار نمائندے شامل ہوں اور یہ کام کم از کم وقت میں ہونا چاہیے، یہ انسانی مسئلہ ہے اور وزیراعظم نے اپنے ”بشرین صدایام“ میں کہا ہے کہ انسانوں کو مسائل میں مبتلا دیکھ کر انہیں دکھ ہوتا ہے۔ ان کی آباد کاری میں غیر جانبداری اور شفافیت کا ہونا اور نظر آنا بے حد ضروری ہے۔ میں چونکہ کراچی کا رہائشی ہوں تو میں نے کراچی کا حوالہ دیا ہے، اگر پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں ”تجاوزات ہٹاؤ مہم“ کے نتیجے میں اس طرح کے مسائل پیدا ہوئے ہیں، تو وہ بھی جناب وزیراعظم اور حکومت وقت کی فوری توجہ کے مستحق ہیں، ایسا نہ ہو کہ دعوے تو روزگار دینے کے ہوں اور ان حسین و دلکش نعروں کی گونج میں جو لوگ کسی طرح اپنی گزر بسر کے لیے مصروف کار تھے، وہ اپنے پہلے سے حاصل وسائل روزگار سے بھی محروم ہو جائیں۔